ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

ترقی پسند اردو شعرا کے ہاں تشکیک کے عناصر

THE ROLE OF SKEPTICISM (TASHKEEK) IN THE POETRY OF PROGRESSIVE URDU POETS.

محمد اویس
پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ لسانیات وادبیات (اردو)، قرطبہ یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، پشاور، پاکستان
ڈاکٹر تحسین بی بی
ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ لسانیات وادبیات (اردو)، قرطبہ یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، پشاور، پاکستان

Abstract:

Skepticism is a philosophical attitude that involves questioning the certainty, validity, or truth of knowledge, beliefs, or claims. A skeptic does not accept ideas without critical examination and demands logical or empirical proof.

This article examines the role of scepticism (tashkeek) in the poetry of Progressive Urdu poets. Though known for their social and political commitment, these poets often use skepticism to question traditional beliefs, expose social injustices, and challenge oppressive systems some progressive poets Faiz, Ali Sardar Jafri, Sahir, Habib Jalib, Ahmad Nadeem Qasmi, Ahmad Faraz, the study shows that skeptical elements deepen the intellectual and emotional impact of Progressive poetry.

Keys Words: **کلیدی الفاظ:**

طبقاتی تفریق ، سرمایہ دارانہ نظام، سماجی ناہمواری، جزاوسزا، ذہنی اضطراب، عقائد، شعور، مابعد الطبعیات، تغیر، حقیقت۔

ترقی پسند شاعری اردو ادب میں سماجی شعور، انسان دوستی اور حقیقت پسندی کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ یہ شاعری فرد کے داخلی کرب کے ساتھ ساتھ اجتماعی دکھوں اور معاشرتی ناانصافیوں کو بھی آواز دیتی ہے۔ ترقی پسند شعرا کی شاعری میں استحصال، غربت، طبقاتی کشمکش، جبر، ناانصافی اور انسانی حقوق جیسے موضوعات نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ شاعر روایتی رومانویت سے ہٹ کر زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بے باکی سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں مزدور، کسان، مظلوم طبقہ اور پسے ہوئے انسان مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ترقی پسند شاعر رائج سماجی ڈھانچوں، طبقاتی تفریق اور سرمایہ دارانہ نظام کی صداقت پر سوال اٹھاتے ہیں۔ وہ اس نظام کو فطری یا لازمی ماننے کے بجائے اسے انسان کی بنائی ہوئی ناانصافی قرار دیتے ہیں۔

یہی سوال اٹھانا تشکیکی رویہ ہے جو ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔ ترقی پسند شاعری میں ریاست، جاگیرداری، سرمایہ داری اور مذہب کے نام پر ہونے والے استحصال پر سوال اٹھایا جاتا ہے۔ شاعر ان طاقتور بیانیوں کی اخلاقی حیثیت کو چیلنج کرتے ہیں اور ان کے دعوؤں کو مشکوک بنا کر پیش کرتے ہیں۔ تشکیک عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی شک، شبہ شک میں مبتلا کرنے کا فعل یا عمل کے ہیں۔ دراصل یہ فلسفۂ مابعد الطبیعیات کی ایک شاخ سے تعلق رکھتا ہے۔ فیروز اللغات میں اس کے معنی یہ ہیں۔

"شک میں ڈالنا، شک شبہ "[1]

اظہر اللغات میں اس کے معنی ہیں:

"شک میں ڈالنا۔ شک "[2]

پروفیسر انور جمال نے اس کی تعریف یوں کی ہے:

> "یہ فلسفے کا ایک مکتب فکر ہے تشکیک کی اصطلاح تیقن کے متضاد استعمال ہوتی ہے اس مکتب فکر یہ ماننے والوں کا خیال ہے کہ ہم کسی بھی مسئلے پر کوئی حتمی اور قطعی رائے نہیں دے سکتے کیونکہ ایک دوسرے کی نفی کر دیتا ہے اور خود دلائل ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں "[3]

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

زندگی کے اسرار و رموز کو سمجھنے کی جستجو جب یقین سے آگے بڑھتی ہے تو تشکیک جنم لیتی ہے۔ یہ دراصل شعور کی وہ کیفیت ہے جس میں انسان اپنی معلوم حقیقتوں پر از سرِ نو غور کرتا ہے۔ انسانی فکر و احساس کی تاریخ دراصل سوال کرنے، تردید کرنے اور یقین کی بنیادوں کو پرکھنے کی تاریخ ہے۔ یہی رویہ آگے چل کر تشکیک کے نام سے انسانی شعور کا ایک بنیادی زاویہ بن گیا۔ ادب ہمیشہ انسان کے باطن کی ترجمانی کرتا ہے، اور جب انسان خود اپنے وجود، عقائد اور نظامِ حیات پر سوال اٹھاتا ہے تو ادب میں تشکیکی رجحانات نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

ترقی پسندوں کا بنیادی نقطہ کارمارکس کا نظریہ غریب مزدور اور پسے ہوئے طبقے کی حمایت کرنا ہے ترقی پسند شعرا نے اس نظریہ کی ترجمانی نہایت خوب صورتی سے کی ہے اسی کے ساتھ اس تحریک سے وابستہ شعرا نے مختلف موضوعات و نظریات کے ساتھ ساتھ تشکیک کے عناصر کو بھی اپنی شاعری میں برتا ہے۔

ترقی پسند شعرا میں فیض ایک نمائندہ شاعر ہیں ان کی شاعری میں تشکیک کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ ان کی ایک نظم جس کا عنوان "مظلوم" ہے اس شعر میں ظلم کو دیکھتے ہوئے اللہ کی ذات سے سوالات کرتے ہیں اور اس کی ذات کو شکوک و شبہات کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

کیا یہی کچھ میری قسمت میں لکھا ہے تو نے ؟
ہر مسرت سے مجھے اگ کیا ہے تو نے
اگر یہ سچ ہے تو تیرے ادلے سے انکار کروں ؟
ان کی مانوں کہ تیری ذات کا اقرار کروں ؟(4)

اس کے علاوہ ایک اور جگہ پر کہتے ہیں۔

وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کے دلوں سے خوف خدا گیا
وہ پڑی ہیں روز قیامتیں کے خیال روز جزا گیا(5)

اللہ کی طرف سے انسان پر آزمائشیں آتی رہتی ہیں بعض اوقات انسان ان پر صبر کرتا ہے اور جو صبر نہیں کرتے وہ بعض اوقات یا تو الحاد کا شکار ہو جاتے ہیں یا اللہ کی ذات پر سوالات اٹھاتے ہوئے تشکیک کا شکار ہو جاتے ہیں فیض کا انداز بھی یہی ہے وہ اپنے زمانے میں ظلم کی انتہا کو دیکھتے ہوئے خدا کی ذات پر سوالات اٹھاتے ہوئے تشکیک کا شکار ہوئے جس کا اظہار انہوں نے اپنی شاعری میں براہِ راست کیا ہے۔

علی سردار جعفری کی شاعری میں جہاں ترقی پسندی کے عناصر موجود ہیں وہیں ان کے ہاں تشکیک کے عناصر بھی موجود ہیں۔

ٹوٹتی ہے کیوں شعاعِ مہر تاباں کی کمند
شب اٹھا لیتی ہے کیوں ناہید و پرویں کا ستار
رات کے ڈھلتے ہی پڑ جاتی ہے پھیکی چاندنی
صبح ہوتے کیوں بکھر جاتا ہے تاروں کا غبار(6)

شاعر سورج اور ستاروں کی روشنی کو "کمند" اور "ستار" کی علامتوں میں پیش کر کے یہ سوال اٹھاتا ہے کہ قدرتی نظام میں یہ تغیر کیوں آتا ہے ؟ یہ "کیوں" کے سوالات دراصل یقین کے بجائے شک و حیرت کی علامت ہیں۔ شاعر کائنات کے اس منظم لیکن پراسرار نظام کی علت اور معنویت پر شکوک کا اظہار کرتا ہے۔ گویا وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر سب کچھ کسی نظام کے تحت ہے تو پھر یہ روشنی کا ختم ہونا یا اجالے کا زوال کیوں ؟ علی سردار جعفری دن اور رات کے تسلسل پر وجودی سوال اٹھاتا ہے کیوں ہر روشنی ماند پڑ جاتی ہے ؟ چاندنی کا "پھیکی پڑ جانا" اور "تاروں کا بکھر جانا" دراصل نظامِ فطرت کے زوال پذیر ہونے پر عدمِ اطمینان ظاہر کرتا ہے۔ یہ احساس کہ ہر چمک عارضی ہے، زندگی کی ناپائیداری اور تغیر کے بارے میں شک و سوال پیدا کرتا ہے یہ اشعار مسلسل تغیر اور فنا کے اصول پر شاعر کے ذہنی اضطراب کی علامت ہیں۔ اسی طرح ایک اور نظم ملاحظہ کیجئے جس میں تشکیک کا پہلو موجود ہے:

معلوم نہیں ذہن کی پرواز کی زد میں
سرسبز امیدوں کا چمن ہے کہ نہیں ہے

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

لیکن یہ بتا وقت کا بہتا ہوا دھارا
طوفان گرو کوہ شکن ہے کہ نہیں ہے
سرمائے کے سمٹے ہوئے ہونٹوں کا تبسم
مزدور کے چہرے کی تھکن ہے کہ نہیں
وہ زیرِ افق صبح کی ہلکی سی سپیدی
ڈھلتے ہوئے تاروں کا کفن ہے کہ نہیں ہے
پیشانیِ افلاس سے جو پھوٹ رہی ہے
اٹھتے ہوئے سورج کی کرن ہے کہ نہیں ہے[7]

یہ تمام اشعار گہرے تشکیکی (Skeptical) عناصر سے مزین ہیں۔ شاعر نے یقین کی جگہ سوال اور تذبذب کو مرکزی حیثیت دی ہے۔ ہر شعر میں ایک داخلی بے یقینی، اضطراب اور مشاہداتی تردد نمایاں ہے۔ پہلے شعر میں علی سردار جعفری انسانی ذہن اور اس کی پرواز پر سوال اٹھاتا ہے۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ کیا انسانی فکر اور شعور کی بلندیوں میں واقعی امید و اطمینان کا کوئی "چمن" موجود ہے یا نہیں۔ یہ فکری تشکیک ہے یعنی انسان کی عقل، سوچ اور امیدوں کے نتائج پر عدم یقین، دوسرے شعر میں "وقت" کے طاقتور تصور پر سوال کرتا ہے۔ عام طور پر وقت کو ایک ناقابلِ شکست قوت سمجھا جاتا ہے، مگر شاعر پوچھتا ہے: کیا واقعی وقت اتنا توانا ہے کہ پہاڑوں کو بھی توڑ دے؟ یہ طبیعیاتی اور فلسفیانہ تشکیک ہے یعنی وقت کی اصل طاقت اور حقیقت پر شبہ، تیسرے شعر میں سماجی و معاشی تشکیک پیش کرتا ہے۔ شاعر سوال اٹھاتا ہے کہ امیر کا تبسم (سرمائے کا مسکرانا) کیا دراصل مزدور کی محنت اور تھکن کا نتیجہ ہے؟ یہ شک طبقاتی ناانصافی، سرمایہ دارانہ نظام، اور انسانی استحصال پر ہے یعنی اخلاقی و معاشرتی تشکیک۔ چوتھے شعر میں علی سردار جعفری صبح کے آغاز کو، جو عام طور پر امید کی علامت ہے، شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ کیا یہ واقعی نئی زندگی کی علامت ہے، یا مرجھاتے تاروں (یعنی ختم ہوتی روشنی) کا کفن؟ یہ حسیاتی و وجودی تشکیک ہے شاعر روشنی اور اندھیرے، آغاز اور اختتام کے درمیان یقین قائم نہیں کر پاتا۔ پانچویں شعر میں شاعر سوال کرتا ہے کہ کیا غربت سے جنم لینے والی چمک (محنت یا امید) واقعی سورج کی کرن ہے، یا محض فریبِ نظر؟ یہ معاشی اور اخلاقی تشکیک ہے شاعر کو یقین نہیں کہ غربت میں امید کا کوئی حقیقی امکان موجود ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے ہاں بھی تشکیک کے عناصر موجود ہیں اور وہ یہی کہتے ہیں کہ ہم کسی بھی چیز کی حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے اور اگر رسائی حاصل کر بھی لیں تو تب بھی ہمیں اس چیز کے حوالے سے گمان رہے گا کہ آیا یہ حقیقت ہے یا نہیں ہے۔

انسان خدا کی جستجو میں
بھٹکا ہے زمیں سے آسماں تک
تکمیل ہے علم کی ادھوری
ہر سچ کی رسائی ہے گماں تک[8]

اللہ اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے اور جیسے سرکش اور نافرمان انسانوں کو طرح طرح کے عذابوں سے ڈرایا گیا کہ نافرمان لوگوں کا ٹھکانہ آگ ہے مگر یہاں احمد ندیم قاسمی شکوک و شبہات کا شکار ہیں کہ ہر انسان اللہ کی تخلیق اور شاہکار ہے تو وہ کس طرح بلاندرِ آتش ہو سکتا ہے؟۔

اے خدا پھر یہ جہنم کا تماشا کیا ہے؟
تیرا شاہکار تو فی النار نہیں ہو سکتا[9]

اس کے علاوہ ایک اور جگہ پر جنت کے حوالے سے شکوک و شبہات میں مبتلا ہو کر کہتے ہیں۔

جیسے ہم آدم و حوا کی سزا بھول گئے
ور غلائے رہے جنت کے نظارے کیا کیا[10]

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

دنیا کی حقیقت کیا ہے اس راز کو سمجھنے کے لیے فلسفیوں نے بہت کوششیں کیں مگر وہ اس حتمی نتیجے تک نہ پہنچ سکے، احمد ندیم قاسمی بھی دنیا کی حقیقت پر غور کر کے تشکیک کا شکار ہیں۔

کس نے دنیا کی حقیقت سمجھی
جس نے سمجھی وہی سودائی ہے
موت کشتوں کے لگائے پشتے
اور خدا ہے کہ تماشائی ہے (11)

ان اشعار میں مابعد الطبیعاتی اور اخلاقی تشکیک کے عناصر موجود ہیں۔ انسانی فہم وادراک کی محدودیت، خدا کی صفات، عدل، اور دنیا کے نظام پر سوال۔ یہ اندازِ فکر اردو شاعری میں فکرِ جدید کا عکاس ہے، جہاں شاعر صرف سوالات کرتا ہے، جوابات نہیں دیتا اور یہی تشکیک کی اصل روح ہے۔

شاعر زندگی یا دنیا کی حقیقت کو ایک پیچیدہ، ناقابلِ فہم معما قرار دے رہا ہے۔ اور جو شخص اس کی حقیقت کو سمجھنے کا دعویٰ کرتا ہے، وہ "سودائی" یعنی پاگل یا دیوانہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں تشکیک کی صورت یہ ہے کہ دنیا کی حقیقت کو سمجھنا ممکن نہیں اور اگر کوئی سمجھنے کا دعویٰ کرے، تو معاشرہ اسے غیر عقلی سمجھتا ہے اس کے ذریعے انسانی شعور، عقل اور ادراک کی محدودیت پر سوال اٹھایا گیا ہے۔

اس کے علاوہ شاعر نے تشکیک کو خدائی تصور کے خلاف احتجاجی لہجے میں پیش کیا ہے۔ دنیا میں ظلم، قتل وغارت، اور انسانیت کی تباہی کے مناظر جاری ہیں ("کشتوں کے لگائے پشتے") مگر خدا خاموش ہے، دیکھ رہا ہے، "تماشائی" بنا ہوا ہے۔ کیا خدا واقعی قادرِ مطلق ہے؟ اگر ہے، تو مظلوموں کی مدد کیوں نہیں کرتا؟ اگر وہ دیکھ رہا ہے، تو کیا اس کی خاموشی عدل ہے؟ شاعر گویا خدا کی عدل وانصاف پر سوال اٹھا رہا ہے، یا کم از کم اس کے عدمِ مداخلت پر حیرت وشکوہ کر رہا ہے۔ خدا کی ذات کے بارے میں ہم نے بہت سنا کبھی خیال کرتے ہیں کہ وہ ہمارے دل میں ہے کبھی کہتے ہیں کہ وہ ہر جگہ موجود ہے مگر قاسمی کو یہ احساس تو ہے کہ خدا کی ذات موجود ہے مگر وہ کچھ اضطراب اور خاص کشمکش میں مبتلا ہو کر خدا کی ذات کے بارے میں لکھتے ہیں۔

خدا نہیں، نہ سہی، نہ خدا نہیں نہ سہی
ترے بغیر کوئی آسرا نہیں نہ سہی
تیری طلب کا تقاضا ہے زندگی میری
تیرے مقام کا کوئی پتا نہیں نہ سہی (12)
تو اتنا قریب ہے کہ تجھ سے
میں پوچھ رہا ہوں، تو کہاں ہے (13)

موسیٰ علیہ السلام اللہ کا دیدار کرنے اور اللہ سے ہم کلام ہونے کے لیے کوہِ طور پر چڑھے تھے مگر وہاں اللہ کا جلوہ ظاہر ہوا کوہِ طور جل گیا اور موسیٰ بے ہوش ہوئے، ندیم قاسمی اس سلسلے میں اضطراب کا شکار ہیں کہ اگر خدا کی ذات موجود ہو تو اسے فرصت ہی کیوں نہیں ہے کہ سوال وجواب کرے۔

ساحر لدھیانوی بھی ترقی پسند شعرا میں ایک اہم نام ہے۔ ان کی شاعری میں ترقی پسندی کے عناصر بھی وافر مقدار میں شامل ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری میں تشکیک کے عناصر واضح دیکھے جا سکتے ہیں۔ وہ خدا کی کرم نوازی اور احسانات کو مانتے ہیں مگر حالات سے مجبور ہو کر بعض اوقات بے اختیار کہہ دیتے ہیں:

یہ سبھی کیوں ہے یہ کیا ہے مجھے کچھ سوچنے دو
کون انساں کا خدا ہے مجھے کچھ سوچنے دو (14)

اسی طرح ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

ہر ایک دور کا مذہب نیا خدا لایا
کریں تو ہم بھی مگر کس خدا کی بات کریں (15)
سزا کا حال سنائیں جزا کی بات کریں
خدا ملا ہو جنہیں وہ خدا کی بات کرے

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

تیرا الطاف کرم ایک حقیقت ہے مگر
یہ حقیقت بھی حقیقت میں فسانہ ہی نہ ہو (16)

ان اشعار میں تشکیک (یعنی شک و تردد) کے عناصر نہایت لطیف انداز میں نمایاں ہیں۔ شاعر نے ایمان، جزا و سزا، اور خدا کے کرم جیسے عقائدی موضوعات پر غور و فکر کے ذریعے ایک باطنی اضطراب یا فکری کشمکش کا اظہار کیا ہے۔ یہاں شاعر دونوں جہانوں (عذاب و ثواب) کے تذکرے کو ایک طرح کے سنی سنائی باتوں کے طور پر پیش کر رہا ہے۔

شاعر گویا سوال اٹھا رہا ہے کہ کیا واقعی سزا و جزا کا حال وہی ہے جو ہمیں بتایا گیا ہے؟ یہ سوال ایمان سے انکار نہیں بلکہ جستجو اور یقین کی تلاش کی علامت ہے۔

ساحر لدھیانوی کے نزدیک صرف وہی لوگ خدا کی بات کریں جو واقعی خدا سے ملے ہوں۔ یہاں شاعر ایک طرح سے ظاہری مذہبیت یا دعویٰ ایمان پر سوال اٹھا رہا ہے یعنی کیا ہم واقعی خدا کو پا چکے ہیں کہ اُس کی بات کریں؟ یہ ایک وجودی یا صوفیانہ شک ہے جو انسان کو سچائی کے قریب لے جاتا ہے۔ شاعر خدا کے کرم کو "حقیقت" مانتا ہے مگر فوراً ایک "مگر" کے ذریعے تردد ظاہر کرتا ہے۔ یہ "مگر" ہی شک کی علامت ہے؛ شاعر تسلیم اور تردید کے بیچ جھولتا دکھائی دیتا ہے۔

مزید یہ کہ شاعر کو اندیشہ ہے کہ کہیں جسے وہ "حقیقت" سمجھ رہا ہے، وہ بھی محض فسانہ (افسانہ، وہم یا تصور) نہ ہو۔ یہ فکری سطح پر حقیقت اور سراب کے درمیان کی کشمکش ہے۔

شاعرِ انقلاب کے نام سے مشہور ہونے والے شاعر حبیب جالب ہیں جنہوں نے ہر دور میں ظلم کے خلاف مذمت کی ہے ان کی شاعری میں زیادہ تر مزاحمت ،انقلابی اور سیاسی نوعیت کے موضوعات ملتے ہیں لیکن وہیں ان کی شاعری میں بعض مقامات پر ہمیں تشکیک کے عناصر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جب شاعر انسانوں پر ظلم ہوتا دیکھتا ہے تو خدا کو پکارنے کی کوشش کرتا ہے مگر جب خدا کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملتا تو اس کی ذات پر سوال اٹھاتا ہوا نظر آتا ہے۔

کوئی پکارتا ہے تجھے کب سے اے خدا
کہتے ہیں تو ہے پاس مگر کتنی دور ہے؟ (17)

شاعر کہتا ہے کہ "کہتے ہیں" یعنی یہ بات صرف روایت یا عقیدے پر مبنی ہے کہ خدا قریب ہے، مگر شاعر کے تجربے میں خدا کی موجودگی محسوس نہیں ہو رہی۔ اس سے یہ تشکیک ابھرتی ہے کہ کیا واقعی خدا قریب ہے؟ اگر ہے، تو پھر سن کیوں نہیں رہا؟ "کوئی پکارتا ہے تجھے کب سے" کا مطلب ہے کہ ایک مدت سے پکار جاری ہے، لیکن کوئی جواب نہیں۔ اس خاموشی سے شاعر کے دل میں شک پیدا ہوتا ہے کہ آیا واقعی کوئی سننے والا ہے یا نہیں۔

؎ خموش کیوں ہو بتاؤ کہاں چلے جائیں
تمہارے در کے سوا اب کہاں ٹھکانہ ہے؟ (18)

شاعر سوال کرتا ہے کہ خدا "خموش کیوں ہو؟"۔ یہ سوال ایک اضطراب کی علامت ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ شاعر کو اُس ذات سے کوئی واضح رہنمائی یا جواب نہیں ملا، جو کہ تشکیک کا مرکز ہے۔ ایک طرف شاعر یہ مانتا ہے کہ "تمہارے در کے سوا اب کہاں ٹھکانہ ہے؟" یعنی وہ خدا کو آخری سہارا مان رہا ہے، مگر دوسری طرف اُس کی خاموشی پر گہرا سوال اٹھا رہا ہے۔ یہ داخلی کشمکش تشکیکی رویے کی واضح علامت ہے۔ خدا جسے چاہے جو عطا کر دے اس علم کو صرف وہ رب ہی جانتا ہے اور یہ علمِ غیب صرف اللہ ہی کے پاس ہے مگر انسان ہمیشہ ہی سے اضطراب کا شکار رہا ہے کہ آخر یہ سب کیا ہے؟ آیا جب کوئی چیز کسی انسان کو ملی تو کیا یہ اس کا حق تھا؟۔

؎ کسی کا حق ہے سمندر پہ اور کوئی پیاسا
یہ کیا ہے؟ کیوں ہے یہ عالم، یہ سوچتے ہیں ہم (19)

شاعر یہ حیرت اور شک کا اظہار کر رہا ہے کہ ایک طرف کسی کے پاس سمندر جیسا بے پناہ پانی ہے، جب کہ دوسری طرف کوئی پیاسا ہے۔ یہ تضاد معاشی و سماجی ناہمواری کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وسائل تو موجود ہیں، مگر تقسیم میں انصاف نہیں۔ نظامِ فطرت یا الٰہی انصاف پر شکوک: "یہ کیا ہے؟ کیوں ہے یہ عالم؟" یہ سوالات محض تجسس نہیں بلکہ کائناتی انصاف پر شکوک و شبہات کا اظہار ہیں۔ شاعر گویا پوچھ رہا ہے کہ اگر قدرت یا خدا عادل ہے تو ایسا ناہموار نظام کیوں ہے؟ "یہ سوچتے ہیں ہم" کا فقرہ شاعر کے ذہنی اضطراب، داخلی کشمکش اور حقیقت کے بارے میں شکوک کو ظاہر کرتا ہے۔ شاعر مطمئن نہیں بلکہ سوال اٹھا رہا ہے جو تشکیک کی بنیادی علامت ہے۔

احمد فراز کوہاٹ سے تعلق رکھنے والے اپنے لہجے کے ایک منفرد شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں موضوعات کا تنوع ہے ان کی شاعری میں معاشرتی ناہمواریوں کا برملا اظہار ہے اور ترقی پسند شاعری میں بھی ان کا شمار کیا جاتا ہے ان کی شاعری میں جہاں تک موضوعات کا تنوع دیکھا گیا ہے وہیں ان کی شاعری میں مذہبی اور عمومی تشکیک

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

کے عناصر بھی موجود ہیں۔فراز اس دنیا کے اسرار و رموز کو جاننے سے ناآشنا ہے اور اس حقیقت کو جاننے کی کوشش کر رہا ہے کہ یہ دنیا کب سے ایسی تھی ان کی ایک نظم بعنوان "تسلسل" میں انہوں نے مختلف سوالات کیے اور دنیا کی حقیقت کو جاننے کی کوشش کی ہے۔

کب سے سنسان خرابوں میں پڑا تھا یہ جہاں
کب سے خوابیدہ تھے اس وادیِ خارا کے صنم
کس کو معلوم یہ صدیوں کے پراسرار بھرم
کون جانے کہ یہ پتھر بھی کبھی تھے انساں (20)

شاعر دنیا کی طویل خاموشی اور ویرانی کی تصویر کشی کرتا ہے، گویا شاعر اس بات پر شکوک کا اظہار کر رہا ہے کہ یہ کائنات کب سے ایک ایسی حالت میں ہے جہاں زندگی کا کوئی نشان نہیں۔ "سنسان خرابے" اور "خوابیدہ صنم" جیسے الفاظ بتاتے ہیں کہ یہاں کوئی حرکت، کوئی شعور یا بیداری نہیں، بلکہ سب کچھ ایک مبہم اور غیر یقینی حالت میں تھا۔ گویا شاعر وجود کے ابتدائی لمحوں پر سوال اٹھا رہا ہے کہ آیا یہ سب کچھ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا یا کسی بے خبر نیند میں ڈوبا ہوا؟ اس کے بعد آگے چل کر انسان کی تقدیر اور انسان کے بارے میں تشکیک کا شکار نظر آتے ہیں۔ شاعر براہِ راست ماضی کی حقیقت پر سوال کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ "کون جانے" یہ فقرہ بذاتِ خود ایک فکری تشکیک کی بنیاد ہے۔ یہاں صدیوں سے قائم "پراسرار بھرم" کی بات ہو رہی ہے، جن کی حقیقت سے کوئی واقف نہیں۔ سب سے زیادہ تشکیک انگیز خیال یہ ہے کہ شاید یہی پتھر جو آج بے جان اور جامد ہیں، کبھی زندہ انسان تھے۔ یہ مفروضہ نہ صرف تاریخی حقیقت پر سوال اٹھاتا ہے بلکہ مخلوقات کی ماہیت اور تبدیلی کی صورتوں پر بھی شکوک پیدا کرتا ہے۔

تا ابد جن کے مقدر میں تھی دنیا اندھیر
یہ مگر عظمتِ انساں ہے کہ تقدیر کے پھیر (21)

اللہ نے تمام انسانوں کو تخلیق کیا ہے اور اس کی اس تخلیق میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہے مگر انسان جب مسلسل درد و غم اور تکالیف میں مبتلا ہو جاتا ہے تو وہ خدا کی طرف رجوع کرتا ہے اور خدا سے جواب چاہتا ہے کہ آیا ایسا کیوں ہو رہا ہے۔

تخلیق عظیم ہے کہ خالق
انسان جواب چاہتا ہے (22)

یہ سوال اس سوچ کی عکاسی کرتا ہے کہ کیا کائنات خود اپنی ساخت اور وسعت کے باعث زیادہ اہم و عظیم ہے، یا وہ ہستی جس نے اسے تخلیق کیا۔ یہاں شاعر ایک واضح عقلی کشمکش میں مبتلا نظر آتا ہے۔ وہ روایتی عقیدے، جس میں خالق کو سب سے بلند و برتر مانا جاتا ہے، پر سوال اٹھاتا ہے اور قاری کو بھی دعوت دیتا ہے کہ وہ خود اس بارے میں غور کرے۔ شاعر تشکیک کو مزید نمایاں کرتا ہے۔ شاعر خود کو یا انسان کو ایک ایسی مخلوق کے طور پر پیش کرتا ہے جو کائنات اور اس کے پسِ پردہ حقائق سے متعلق مطمئن نہیں بلکہ سوالات سے گھرا ہوا ہے۔ یہاں یقین کی بجائے تجسس، تذبذب، اور تشکیک غالب ہے۔ گویا یہ شعر خالصتاً ایک وجودی تشکیک کا مظہر ہے، جہاں انسان کائنات اور اس کے خالق کے باہمی رشتے کو سمجھنے کے لیے جستجو میں ہے، مگر کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچتا۔ اس میں شاعر کسی عقیدے کا انکار نہیں کرتا، لیکن یقین کے بجائے سوال کو ترجیح دیتا ہے۔ فراز کے نزدیک بس خدا کا تصور یہی ہے کہ وہ ہم سے اس قدر دور ہے کہ نہ ہی ہم اسے دیکھنے کی تاب رکھتے ہیں اور نہ ہی ہم اس کو چھو سکتے ہیں فراز کے نزدیک شاید خدا اسی کا نام ہے۔

نمائندہ ترقی پسند شعرا کی شاعری میں تشکیکی عناصر کے موضوعات کا تنوع موجود ہے ، وہیں دوسرے کئی ترقی پسند شعرا کے ہاں بھی اس پہلو کے حوالے سے مذہبی، عمومی اور سماجی و معاشرتی ناہمواریوں کا برملا اظہار ملتا ہے اور انہوں نے ترقی پسندیت پر مشتمل شاعری کے ساتھ ساتھ تشکیک کے عناصر کو بھی کہیں واضح اور کہیں علامتی پیرائے میں بیان کرتے ہوئے زندگی و کائنات کے اسرار و رموز کو سمجھنے کی جستجو ،انسانی فکر و احساس کی تاریخ اور یقین و تردید کی بنیادوں کو پرکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں خود اپنے وجود، عقائد اور نظامِ حیات پر سوال اٹھاتے ہوئے شاعری میں تشکیکی رجحانات کو نمایاں کیا ہے۔

حوالہ جات

1. فیروز الدین، الحاج مولوی، فیروز اللغات اردو جامع، لاہور: خضر جاوید پرنٹرز، 2010، ص 361
2. محمد امین بھٹی، الحاج محمد ثقلین بھٹی، اظہر اللغات اردو (جدید) لاہور: اظہر پبلشرز، ص، 188

ISSN E: 2709-8273
ISSN P:2709-8265
JOURNAL OF APPLIED LINGUISTICS AND TESOL
JALT

3.انور جمال،ادبی اصطلاحات،اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن،2021,ص،64
4.فیض احمد فیض،نسخہ ہائے وفا،لاہور: مکتبہ کارواں، س ن،ص618
5.ایضاً،ص،548
6.سردار جعفری،خون کی لکیر، بمبئی: نوہند پبلشرز لمیٹڈ،1949.ص،43
7.ایضاً،ص،49
8.احمد ندیم قاسمی،کلیات احمد ندیم قاسمی، نئی دہلی: فرید بکڈپو، طبع اول، دسمبر 2004ء ص،63
9.ایضاً،ص،66
10.ایضاً،ص،70
11.ایضاً،ص،80
12.ایضاً،ص،88
13.ایضاً،ص،107
14.ساحر لدھیانوی،کلیات ساحر، حیدر آباد: حسامی بک ڈپو مچھلی کمان، فروری،1998،ص۔134
15.ایضاً،ص،253
16.ایضاً،ص،28
17.حبیب جالب،کلیاتِ حبیب جالب،لاہور: ماورہ پبلشرز، بار چہارم 2005ء ص،457
18.ایضاً،ص،429
19.ایضاً،ص،270
20.احمد فراز،کلیات احمد فراز، تنہا تنہا، نئی دہلی: فرید بک ڈپو،اشاعت سوم،2010ء،ص،442
21.ایضاً،ص،443
22.احمد فراز،کلیات احمد فراز،دردِ آشوب، نئی دہلی: فرید بک ڈپو،اشاعت سوم،2010ء،ص،322